Vol.4 No.4 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

مرزا غالب کی شاعری اور وحدتُ الوُجودی عناصر کا اظہار

MIRZA GHALIB'S POETRY AND EXPRESSION OF THE UNITY OF EXISTENCE

1. ایاز علی، پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر

2. پرویز احمد، پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر

3. گل محمد سہتو، ایم فل ریسرچ اسکالر

ABSTRAC:

Some of the poems in Ghalib's poetry contain the theory of unity of existence. They have both generality and specialty. The ones that are characteristic are those that contain rational, logical and philosophical principles and the ones that are general are the ones that contain mystical beliefs. From which it is clear day by day that the presence of a few philosophical poems in the words of a poet is not the cause of his being a Wahdat-ul-Wujudi poet. Because Wahdat-ul-Wujud is not only a poetic theory but also a rational, Islamic, monotheistic and monotheistic belief. The concept is specific to intellect, mysticism and wisdom. This is a rational theory, it is inappropriate to call it Sufi.

KEY WORDS: *Theory of Unity, Wahdat-ul-Wujudi, Wisdom, Ghalib, Belief, Philosophical Principles, Mystic.*

عقل ہی انسان کی اصل ہے۔ انسان اور حَیوان کی امتیاز عقل ہی سے ہے۔ عقل ہی علم کا ظرف ہے، جس کی وجہ سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ جہاں عقل ہے، وہاں حصول علم بھی ممکن ہے، دنیامیں ترقی و تبدیلی بھی اسی کی وجہ سے ہے۔ چونکہ عقل کے بغیر علم ناممکن ہے اور جانوروں کے پاس عقل نہیں، اس لیے جانوروں کے پاس علم بھی نہیں ہے اور ان کی زندگی میں نہ کوئی ترقی ہے اور نہ کوئی تبدیلی! فطری شعور اور علم کی بحث جدا ہے۔ اسی عقل ہی کی وجہ سے نوعِ انسان کو، نوعِ عقل بھی کہا جاسکتا ہے۔ دنیاومافیہا انسان کے لیے خلق ہوئے ہیں؛ یعنے عقل کے لیے خلق ہوئے ہیں۔ انسان پوری دنیا میں آباد ہیں، اس لیے عقل کسی خاص انسانی طبقے کی میراث نہیں ہے۔ یہ دنیا عقلمندوں کے دم سے ہے، اس میں علمی و ادبی و فکری و فنی و مادی و ذہنی ترقی کی معراج اسی انسانی عقل ہی سے ہے، اس لیے یہ ترقی کی معراج کسی خاص انسانی طبقے کی میراث نہیں ہے۔ جہاں عقل ہے وہاں ترقی ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے: "عقل، افکار کی رہنما ہے۔ افکار، قلوب کے رہبر ہیں، قلوب، حواس کے اور حواس، اعضا کے رہبر ہیں"۔(۱) اور جانوروں کے پاس سوائے حواس اور محسوسات کے کچھ اور ہے ہی نہیں؛ ان کے پاس عقل، افکار اور قلوب نہیں ہیں، تو ان کی زندگی میں ترقی و تبدیلی بھی نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے بھی علمی و ادبی و فکری و فنی و مادی و ذہنی و عملی و نظری نظریات و قوانین پیش ہوئے ہیں، وہ سب اسی سلیم عقل کے سبب سے ہیں۔ وہ سارے نظریات و قوانین عقلی ہونے کی وجہ سے اٹُوٹ ہیں۔ جبکہ جانوروں کی زندگی نظریہ ساز نہیں ہے، اس وجہ سے ان کی زندگی میں نہ کوئی نظریہ ہے اور نہ کوئی قانون۔ وحدت الوُجود بھی ایک انسانی سلیم عقلی و عملی اُصول و قوانین و نظریات میں سے ایک ہے؛ اس لیے اٹُوٹ ہے۔ وحدت الوجودی کا مطالعہ بھی عقلی و فکری اصول و قوانین و وحدت الوجودی فکر و نظر سے کرنا چاہیے، تاکہ مفاہیم مبہم نہ ہوجائیں۔ جس طرح عالم عقول کا مطالعہ، عالم سفلی کی نظر و نظیر و مثال سے کرنے سے، یا عالم سفلی کا مطالعہ کرنے کے دوران، اس کا عالم علوی سے موازنہ کرنے سے مفاہیم مبہم ہوجاتے ہیں یا دلیل لمی کا مطالعہ دلیل انی کی نظر سے کرنے سے نتائج غلط ثابت ہوتے ہیں۔

مرزا اسداللہ خان غالب کے کلام میں بھی وحدت الوجودی فکر موجود ہے۔ انھوں نے اسی عین سلیم عقلی و نظری و فطری و فکری و عملی قانون و نظریہ و اصول کو جس وحدت الوُجودی فکر سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے، اس کا مطالعہ بھی اسی فکر و نہج سے کرنا چاہیے تاکہ مطالب و مفاہیم میں خلط ملط نہ ہونے پائے۔

وحدتُ الوُجود ایک خالص سلیم عقلی اصول؛ منطقی اور فلسفی اصطلاح ہَے؛ منطق اور فلسفہ عقلی اصول پر مشتمل علم ہے۔ اس اصطلاح کو شیخ اکبر ابن العربیؒ نے مسلم دنیا میں بامِ عروج تک پہنچایا۔ مسلم دنیا نے سب سے زیادہ اثرات اسی سے قبُول کیے ہیں۔ اس کا مطلب ہَے: کائنات میں مَوجود ہر شَے کا وُجود ایک ہی موجود وُجود و مبداء سے ہے، ہر شَے کا وجود اسی ایک ہی وُجود سے ہے، وجودی لحاظ سے ہر شے اسی ایک ہی وجود سے صادر ہوئی ہے۔ اس لیے کائنات میں اسی ہی ایک کا وجود ہے۔ اسی کے وجود کے علاوہ کسی اور کا وجود ہی نہیں ہے، وہ کل و جزو کی قید سے بھی ماورا ہے۔ ماسوا اس کے وجود کے، سب اعتباری و مفہومی ہیں۔ اسی ہی ایک وجود کی معرفت و تفہیم کے لیے، عقل نے تین مفاہیم و تصوراتی اصطلاحیں؛ واجب الوجود، ممکن الوجود اور ممتنع الوجود وضع کی ہیں؛ ممتنع الوجود کو عدم الوجود بھی کہتے ہیں۔ وہ ان کی لغوی و اصطلاحی وضاحت اس طرح کرتے ہیں

---

1. لیکچرار، شعبہ اردو، شہید بے نظیر بھٹو یونی ورسٹی، نواب شاہ

2. لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج کنڈیارو

3. جامعہ شاہ عبداللطیف، خیرپور

Vol.4 No.4 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

: واجب کے معنٰی ہیں: "ضروری. لازم. جو اپنے وجود میں دوسروں کا محتاج نہ ہو. ہمیشہ. دائم اور وجود کے معنٰی ہیں: "زندگی. ہستی. ذات. ظہور. مادہ. جوہر". یعنے واجب الوجود وہ وجود ہے: "جس کی ذات اپنے وجود میں کسی کی محتاج نہ ہو". ممکن کے معنٰی ہیں: "جو ہو سکے، ہونے کے قابل، قابلِ امکان۔ منطق میں وہ شَے جو معرض زوال و فساد ہو، جس کا وجود کسی دوسری شَے کا محتاج ہو". اور وجود کے معنٰی ہیں: "زندگی. ہستی. ذات. ظہور. مادہ. جوہر". یعنے منطق میں "ممکن الوجود وہ وجود ہے یا وہ شَے ہے جو معرض زوال و فساد ہو، جس کا وجود کسی دوسری شَے کا محتاج ہو، جو اپنے وجود میں کسی دوسرے وجود کا محتاج ہو". ممتنع کے معنٰی ہیں: "باز رکھا گیا. روکا گیا" اور وجود کے معنٰی ہیں: "زندگی. ہستی. ذات. ظہور. مادہ. جوہر". (۲) یعنے ممتنع الوجود وہ وجود ہے: جسے عدم الوجود بھی کہتے ہیں، جو ناپید ہے، نہیں ہے، نیستی کے حکم میں ہے، نہ ہونا، غیر حاضر ہے.

عدم الوجود کا تو وجود؛ نام و نشان ہی نہیں ہے، اس پر بحث بھی ممتنع و عدم ہے۔ ممکن الوُجود وہ موجود ہے، جو ہو سکتا ہے، جس کے ہونے کا امکان ہے، جو قابلِ امکان ہے۔ یہ وہ شَے ہے جو معرض زوال و فساد ہے، جس کا وجود کسی دوسری شَے کا محتاج ہے۔ اس لیے ان کا وُجود اپنا ذاتی وُجود نہیں ہے۔ جب ان کا اپنا ذاتی وجود نہیں ہے تو وہ ذاتی طور پر عدم کی طرح، عدم کے حکم میں ہے. چونکہ ممکنات کا اپنا ذاتی وُجود نہیں ہے، تو یقین انھوں نے اپنا وجود کسی اور سے ادھار لیا ہو گا، اور انھیں ادھار بھی وہ دے سکتا ہے جس کا اپنا وجود ذاتی ہو تا ہے۔ اس لیے انھیں عارضی وجود اسی ہی نے دیا ہے جس کا وجود اپنا ذاتی ہے اور واجب الوجود کے علاوہ کسی کا بھی وجود اپنا ذاتی وجود نہیں ہے اس لیے ممکن الوجود کو واجب الوُجود ہی نے اپنے ذاتی وُجود سے عارضی وُجود کا لباس عطا کیا ہے، لیکن بطور جزو و اجزا وحصہ نہیں، بلکہ بطور مفہوم و سایا و تجلی و شئون عطا کیا ہے. واجب الوجود نے ممکن الوجود: ممکنات کو جو عارضی وجود عطا کیا ہے، وہ کسی غیر سے ادھار یا عارضی لے کر انھیں عطا نہیں کیا، بلکہ انھیں اپنے ذاتی وجود اور اپنے ذاتی جوہر ہی سے عطا کیا ہے. کیونکہ اگر واجب الوجود کسی اَور سے، یا کسی دوسرے غیر وجود سے، ادھار لے کر، ان ممکنات اور مخلوقات کو وجود کا لباس عطا کرتا تو واجب الوجود کو بھی، ممکن الوجود کو وجود عطا کرنے میں، کسی دوسرے یا غیر کے وجود کا محتاج ہونا تسلیم کرنا پرے گا اور واجب الوجود کا وجود بھی ناقص تسلیم کرنا پڑے گا. اس کے علاوہ واجب الوجود کے سوا کسی دوسرے کے ذاتی وجود کو بھی قدیم اور ازلی واجب الوجود تسلیم کرنا پڑے گا، جس سے اسی واجب الوجود نے، انھی ممکنات کو عارضی وجود کا لباس ادھار لے کر عطا کیا. اس لیے واجب الوجود کی توحید و تنزیہ کا عقلی اصول یہ ہے کہ وجود صرف واجب الوجود قائم بذات کا ہے، اس کے علاوہ کسی اَور کے وجود کا کوئی نام و نشان نہیں ہے، اسی نے ممکن موجودات کو اپنے ہی وجود سے ممکن اور عاضی وجود عطا کیا ہے. اس لیے وجود ہی واجب الوجود کا ہے، اسی کے وجود کے علاوہ کسی دوسرے کا وجود ہی نہیں ہے، ممکنات اس کا شئون اور سایا ہیں؛ جیسے سورج اور اس کی روشنی؛ اسی لیے اسی ہی کا وجود ہے، اس کے وجود کے سوا کسی اور کا وجود نہیں ہے اور وحدت الوجود؛ اتحادِ واجب الوجود و ممکن الوجود اور ودم الوجود بھی نہیں ہے۔ یہی وحدت الوجود ہے۔ بس غور و فکر کا آخری نتیجہ نہ عدم ہے اور نہ ممکن بلکہ وجود ہے، بس وجود واحد ہے، وہ واجب الوجود ہے۔ خارج میں اسی ہی کا مصداق ہے۔ کیونکہ عدم کا نام و نشان ہی نہیں، ممکن بے چارا، بے چارا ہی ہے۔

وحدت الوجود عقلی، منطقی اور فلسفی اصولوں پر مشتمل ہے. وہ صرف نظریہ نہیں ہے بلکہ عین عقلی، عین اسلامی، عین وحدتی و توحیدی اصول و عقیدہ ہے. وہ الہیات اور عرفانی رمزوں سے مُزین ہے اور ہر صاحب عقل کے لیے باعثِ تسکین ہے. اس کا عامیانہ مفہوم صوفیا سے مختص کہا جاتا ہے اور اس کا خصوصی مفہوم عقلا و عرفا و حکما سے مختص ہے. یہاں اجمالی طور پر اس کی غلط تعبیرات کے اسباب و عوامل درج کیے جاتے ہیں تا کہ اس کی حقیقت کا سمجھنا آسان ہو سکے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ "شعر العجم" میں وحدت الوجود کی غلط تعریف بیان کرتے ہوئے ہر شے کو خدا قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے سرے سے وحدت الوجود کی وضاحت ہی باطل کی ہے۔ چونکہ اسی کتاب کو اردو دان طبقے میں خاصی شہرت حاصل ہے، شاید وحدت الوجود کی مخالفت اور اس کی غلط تفہیم کا سبب یہی وضاحت ہے. اگر اسی تعریف کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو سب کچھ خدا قرار پائے گا، اسی طرح نہ صرف وحدت الوجود کا فکری نظام ہی باطل قرار پائے گا بلکہ نظامِ توحید ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں: "رفتہ رفتہ یہ خیال وحدت الوجود کی حد تک جا پہنچا یعنی یہ کہ درحقیقت خدا کے سوا کوئی اور چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے، یا یوں کہو کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے". (۳) پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مولانا کی اسی وضاحت کی " شرح دیوان غالب " میں تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں: "مولانا کے جملہ پر غور کرو، چونکہ انھوں نے غیر محتاط انداز میں، اعتبار قائم کیے بغیر، ایک بات لکھ دی؛ اس لیے مفاسد کا دروازہ کھل گیا. سوال یہ ہے کہ: جو کچھ موجود ہے، وہ کس اعتبار سے، سب خدا ہی ہے؛ بحسب الوجود یا بحسب الذوات؟ بالفاظِ دیگر وجود کے اعتبار سے یا تعینات کے اعتبار سے؟ چونکہ مولانا نے اپنے جملے میں اعتبار کی وضاحت نہیں کی، اس لیے اس کا مفہوم لازمی طور سے منجر بضلالت ہو گیا. یہ جملہ یوں لکھنا چاہیے تھا؛ جو کچھ موجود ہے اگرچہ باعتبار وجود سب خدا سے ہے، مگر باعتبار ذوات خلق یا باعتبار تعینات، کوئی شے بھی خدا نہیں ہے. یہ سچ ہے کہ جو کچھ بھی موجود ہے، من حیث الوجود (باعتبار وجود) خدا ہے، مگر آپ کسی شے کی طرف اشارہ کر کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ چیز خدا ہے یا وہ چیز خدا ہے، کیونکہ جو کچھ نظر آتا ہے وہ اگرچہ باعتبار وجود خدا ہے مگر باعتبار تعینات خدا نہیں ہے، بلکہ غیر خدا ہے اور جو شے بھی نظر آتی ہے وہ متعین ہے اور وجود متعین خدا نہیں ہے۔ اس لیے کوئی شے خدا نہیں ہے". (۴) اگر کسی نے کائنات اور واجب الوجود کو دو وجود تسلیم کر لیا تو اس نے دوئی اختیار کی، یہ عینیت صرف وجود کے اعتبار سے ہے، ذات کے اعتبار سے غیر ہے۔ اس لیے کوئی شے خدا نہیں ہے۔ وجود کے اعتبار سے ہر شے خدا ہے، ذات کے اعتبار سے ہر شے غیر خدا ہے۔

چونکہ وحدت الوجود عقلی، منطقی اور فلسفی اصولوں پر مشتمل ہے. وہ صرف نظریہ نہیں ہے بلکہ عین عقلی، عین اسلامی، عین وحدتی و توحیدی عقیدہ ہے، وہ الہیات اور عرفانی رمزوں سے مُزین ہے اور ہر صاحب عقل کے لیے باعثِ تسکین ہے. اس کا عامیانہ مفہوم صوفیا سے مختص ہے اور اس کا خصوصی مفہوم عقلا و عرفا و حکما سے مختص ہے؛ اس کی

Vol.4 No.4 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

صداقت پر متکلمین نے بھی اعتراضات کیے ہیں، حتیٰ کہ وحدت الوجود کی بحث متکلم افراد کی فکر سے بھی بلند ہے؛ کیونکہ "علم الکلام کی فکری توحید دلیل انی یعنی معلول سے علت کی طرف ایک حد تک سیر کراتی ہے جبکہ عقلی فلسفی فکری توحید دلیل لمی یعنی علت سے معلول کی طرف بازگشت کرتی ہے، جبکہ منطق میں اصل اہمیت دلیل لمی کو حاصل ہے اور دلیل انی خود بیچاروں کا سہارا ہے، اگر دلیل لمی کو قبول نہ کیا جائے تو توحید منہدم ہو جائے گا"۔(۵) وجود اور عدم ایک دوسرے کے انحصاری نقیض ہیں اور انحصاری اضداد کا جمع ہونا محال عقلی ہے۔ عدم، جس کا نام ونشان ہی نہیں ہے، اس کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے۔ چونکہ حقائق اور ماہیات میں انقلاب ناممکن ہے، اس لیے نہ وجود، عدم میں تبدیل ہو سکتا ہے اور نہ عدم، وجود میں۔ بس حقیقی وجود پر عدم طاری نہیں ہوتا۔ ہر شے جس پر عدم طاری نہ ہو اسے واجب الوجود کہتے ہیں، وہ بسیط ہے، اجزا سے مرکب نہیں ہے، کیونکہ مرکب اجزا کا محتاج ہوتا ہے، یہاں تک کہ واجب الوجود، عدم و وجود کا مرکب بھی نہیں ہے۔ وجود کا ذاتی استقلال ہے۔ کائنات وجود حقیقی کا شئون ہیں، جس میں اضافت نہیں ہے۔ کائنات وجود کی طرف نہ نسبت ہے اور نہ مقابلہ، ورنہ تکرار لازم آئے گا، کیونکہ تکرار حدود میں ہوتا ہے، اس لیے واجب الوجود تکرار سے منزہ ہے اور وہ ماضی، حال اور مستقبل سے بھی ماورا ہے، یہی وحدت الوجود حقیقی ہے۔ ویسے بھی جب وجود، عدم اور ممکن کا تذکرہ ہوتا ہے تو وجود ہی کا وجود تسلیم کرنا پڑتا ہے، عدم اور ممکن کا نہیں! کیونکہ عدم اور ممکن کا تو وجود ہی نہیں ہے، یہ وُجود کے نقیض ہیں، تو انہیں کیوں تسلیم کیا جائے۔ وجود کے معنیٰ ہیں، 'ہونا'، عدم کے معنیٰ ہیں 'نہ ہونا' اور ممکن کے معنیٰ ہیں: 'کسی سے وجود لے کر وجود میں آنے کا امکان ہونا'۔ لفظی معنیٰ ہی سے واضح ہے کہ عدم کے وجود کا تو نام ونشان ہی نہیں ہے، اس کا ہونا سرے سے باطل ہے، تو اس کا وجود تسلیم کرنا بھی باطل ہے۔ ممکن کا بھی اپنا ذاتی وجود نہیں ہے، اسی نے بھی عارضی وجود خیرات میں مانگا ہے اور اسے واجب الوجود ہی نے وجود عطا کیا ہے، تو ممکن کا بھی اپنا ذاتی وجود تسلیم کرنا محال اور باطل ہے۔ بس وجود کا ہی ذاتی وجود ہے، جو قائم بذات ہے اور قدیم اور ازلی ہے۔ واجب الوجود نے ممکن الوجود کو وجود، کسی اور سے عارضی اور مستعار لے کر نہیں دیا ہے بلکہ اسے اپنے ہی وجود سے عطا کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو کسی اور کا وجود بھی تسلیم کرنا پڑے گا، جس سے واجب الوجود نے ادھار لیا ہے اور اسے بھی واجب الوجود کے ساتھ ساتھ قدیم، ازلی، قائم بذات اور دوسرا واجب الوجود تسلیم کرنا پڑے گا اور واجب الوجود کو محتاج بھی ماننا پڑے گا، جو سراسر باطل ہے اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ واجب الوجود نے انہیں عدم سے پیدا کیا ہے، تو اسے وجود، ممکن اور عدم کا ایک بار پھر عقلی مطالعہ کرنا چاہیے، یا دلیل انی اور دلیل لمی کے فرق کا عقلی مطالعہ کرنا چاہیے! بس وجود واجب الوجود کا ہے، کسی اور کے وجود کا نام ونشان بھی نہیں ہے، یہی وحدت الوجود ہے۔

مرزا غالب قادرالکلام شاعر ہیں، اس کا کلام وحدت الوجودی فکر سے بھی مزین ہے، اس کے کلام کا مطالعہ اسی جہت سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ سب سے اول اس کے ایک مشہور و معروف شعر کا اسی نقطہ نظر سے تجزیہ کرتے ہیں، جس کے لیے کیا جاتا ہے کہ وہ وحدت الوجودی فکر پر مشتمل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا! (۶)

مرزا غاؔلب کا یہ شعر اکثر اور عمومی طور پر فلسفہ وحدت الوجود کے ان مشہور اشعار میں سے گردانا جاتا ہے، جن میں انھوں نے عقیدۂ وحدت الوجود کو عین عقلی اور عین عملی اصولوں کے مطابق ثابت کرنے کے لیے حکمتِ متعالیہ: فلسفۂ اولیٰ: الٰہیات کا راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ اس شعر میں اپنی ہستی کی مذمت کرتے ہیں اور ذات واجب الوجود مبدائے فیض کو تمام ممکن موجودات اور ممکن مخلوقات کا فیض رسا اور مرکز و محور قرار دیتے ہوئے اپنے ہی وجود کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ غلام رسول مہر نے بھی مولانا الطاف حسین حالؔی کے حوالے سے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے کہا ہے: وہ کہتے ہیں: "بالکل نئے طریقے سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر عدم محض ہونے کی تمنا کی ہے پہلے مصرع کے معنیٰ تو ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا برائی ہوتی۔ مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا۔ مطلب یہ کہ خدا ہوتا۔ کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔ مقصد یہ ہے کہ وجود حقیقی ایک ہے اور وہ خدا ہے۔ اسی مبدائے فیض سے ہر وجود پیدا ہوا ہے، جن کی ہستی عارضی ہے، اگر یہ وجود ممکن نہ ہوتا تو مبدائے حقیقی (کے علم) میں شامل ہوتے اور اس کے سوا کچھ نہ ہوتا، کیونکہ جب کچھ نہیں تھا تو خدا تھا اور کچھ نہ ہوتا تو اس حالت میں بھی خدا ہی ہوتا"۔(۷) شاید حالؔی نے یہاں نیستی سے مراد عدم بمعنی وجود لیا ہے، جبکہ یہاں خود غالب کی فکر میں بھی نقص دکھائی دیتا ہے، کیونکہ وہ خود کو وجود غیر سمجھتا ہے۔ بقول حالی: قائل کا مقصود یہی ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا۔ مطلب یہ کہ خدا ہوتا۔ تو اس سے مراد غالب ممکن کو نہیں بلکہ وجود یا ذات کو اہمیت دے رہا ہے۔ کیونکہ نیستی کے معنی ہیں عدم محض یا عدم مطلق، جس کے وجود کا کوئی نام ونشان نہیں اور اس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، جبکہ ممکن موجودات کو لباسِ وجود واجب نے اپنے وجود سے عطا کیا ہے۔ اس لیے غاؔلب کا کہنا ہے: اگر میں لباسِ ممکنات میں سے نہ ہوتا تو میں لباس واجب الوجود میں ہوتا، کیونکہ ممکنات کو وجود کا لباس ذاتِ واجب نے اپنے ذاتی وجود میں سے عطا کیا ہے، یہاں خود غالب کی بھی فکری کوتاہی بھی ہے کہ اس نے خود کو وجودِ غیر تسلیم کیا ہے؛ جو "نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا" کہتا ہے۔ مولانا نیاز فتح پوری نے بھی 'ولی بادہ خوار' میں اسی شعر کی باطل تشریح درج کر کے مفہوم کو اور بھی زیادہ مبہم کر دیا ہے۔ شاید وہ وحدت الوجود کی اصطلاحات کے مفاہیم سے بے خبر ہے۔ "کہا جاتا ہے" سے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ جملے مولانا کے نہیں ہیں۔ اس لیے ایسی باطل تشریح بطور تائید درج کرنا نازیب نہیں سمجھتا! وہ کہتے ہیں: "کہا جاتا ہے غاؔلب نے اس شعر میں 'وحدت الوجود' کا صوفیانہ عقیدہ پیش کیا ہے لیکن نہایت پامال و پیش پا افتادہ انداز سے، جس میں عدم اور خدا، دونوں کو ایک ہی سطح پر جمع کر دیا ہے۔ وحدت الوجود کا اصطلاحی مفہوم سادہ زبان میں یہ ہے کہ ہر چیز میں خدا جلوہ گر ہے۔ خیر یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس میں اس قدر غلو سے کام لینا کہ عدم کو بھی خدا سمجھ لیا جائے، بالکل بے معنیٰ سی بات ہے"۔(۸) مولانا نیاز فتح پوری نے

Vol.4 No.4 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

شاید یہ سمجھا ہے کہ غاؔلب عدم کا قائل ہے، جو اس کے بیان سے تو واضح ہے. پھر 'وحدت الوجود' جیسے عقلی اور منطقی نظریہ کو صوفیانہ عقیدہ کہنا بھی سراسر 'عقیدہ وحدت الوجود' کی حقیقت سے ناآشنائی کا ثبوت ہے. اگر کلام غاؔلب کا مطالعہ کیا جائے تو ایک مبتدی بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ غاؔلب عدم کے وجود کا قائل نہیں ہے، بلکہ وہ عدم کے وجود کو باطل اور نقیضِ وجود تسلیم کرتا ہے. یہ اور بات ہے کہ کلام غالب کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غالب خود بھی حقیقت وحدت الوجود سے ناآشنا ہیں۔ مذکورہ بالا شعر میں بھی، عمومی طرح سے 'نہ تھا کچھ' سے مراد ممکنات ہیں، عدم نہیں کیونکہ غاؔلب دوسرے مصرع میں خود واضح کرتا ہے، کہ 'نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا' یعنی اگر مَیں وجود امکان میں نہ ہوتا تو وجودِ خدا میں ہوتا، ممکنات میں سے نہ ہوتا. دوسری بات 'وحدت الوجود' کو صوفیانہ عقیدہ کہنا بھی عقلی اُصولوں کے خلاف ہے. وجود، عدم اور ممکن کی مختصر وضاحت سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ 'وجود صرف واجب الوجود کا ہے، عدم الوجود کا نام ونشان ہی نہیں اور ممکن الوجود کو واجب الوجود نے عارضی وجود اپنے ذاتی وجود سے عطا کیا ہے. تو وجود تو صرف ایک کا ثابت ہوتا ہے؛ اسے محض صوفیانہ کہنا حقیقی عقلی وحدت الوجود کا انکار کرنا ہے۔ بہر حال وہ کہتے ہیں: "نہ تھا کچھ تو خدا تھا" یعنے جب کچھ بھی نہ تھا؛ ممکن موجودات اور ممکن مخلوقات میں سے کسی بھی ممکن موجود اور ممکن مخلوق کا وجود ہی نہ تھا، تب بھی واجب الوجود کا وجود تھا اور وہ موجود تھا۔ "کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا" یعنے اگر ممکن موجودات اور ممکن مخلوقات میں سے کسی بھی ممکن موجود اور مخلوق کا کوئی وجود ہی نہ ہوتا تب بھی واجب الوجود قائم بذات کا وجود ہوتا. "ڈبویا مجھ کو ہونے نے" یعنی مجھے ممکن موجود وجود ہونے نے رسوا کیا ہے، مجھے اپنے حقیقی، اصلی اور ذاتی ارفع واعلی واکبر واعظم مقام ومرتبہ سے دور اسفل واخس مقام ومرتبہ پر ظاہر کیا ہے. "نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا" یعنے اگر میں ممکن کے وجود کی صورت میں موجود نہ ہوتا تو بالیقین تب بھی واجب الوجود قائم بذاتِ کے وجود کے ارفع واعلی واکرم واعظم وافضل مقام ومرتبہ پر فائض ہوتا۔ بس غالب کے اس شعر میں بھی دوئی کا تصور واضح نظر آتا ہے۔ یہ شعر متصوفانہ ہوسکتا ہے، فلسفیانہ نہیں ہے. اس بات کی طرف اشارہ کرچکے ہیں کی اس شعر میں عمومیت ہے، خصوصیت نہیں ہے اور یہاں عمومی وضاحت درکار ہے؛ ورنہ واجب الوجود کی صفت ظاہر پر بحث کرکے اس شعر کو وجودیت کی بحث سے خارج کیا جاسکتا ہے، کہ وہ کب ظاہر نہ تھا؟؟؟!!! بحر حال عمومی بحث کرتے ہوئے یں۔

غاؔلب کے کلام میں ایسے اور بھی اشعار بھی ملتے ہیں، جن میں منطقی و فلسفی عمومی مفاہیم بھی واضح نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں:

نمودِ عالم اسباب کیا ہے؟ لفظِ بے معنٰی

کہ ہستی کی طرح مجھ کو عدم میں بھی تامل ہے (۹)

جزو نام، نہیں صورتِ عالم، مجھے منظور

جزو ہم، نہیں ہستی اشیا، مرے آگے (۱۰)

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے، عالم

لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں (۱۱)

اس کا واضح مفہوم یہ ہے؛ نمودِ عالم اسباب؛ عالم اسباب، دنیا، ممکنات کی نمود ونمائش یہ سراسر ایک بے معنٰی لفظ ہے. اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں، مَیں تو ہستی یعنی وجود کا بھی قائل نہیں ہوں، مَیں عدم کی طرح وجود کا بھی قائل نہیں ہوں، یعنی مَیں نہ عدم کے ذاتی وجود کا قائل ہوں، نہ ہستی و وجود کے ذاتی وجود کا قائل ہوں!!! جب وجود وعدم دونوں کو ختم کردیا تو قصہ پاک ہوگیا. عالم اسباب کی محض نمود ہی باطل نہیں بلکہ اس کا عدم بھی باطل ہے، نہ وجود کا اطلاق جائز ہے اور نہ عدم کا. نہ عدم کا کوئی وجود ہے اور نہ کوئی عالم اسباب کا اور وجود کا. عالم اسباب لفظ بے معنٰی ہیں، یعنی عالم اسباب کا اپنا کوئی ذاتی معنی نہیں. تو سوال یہ ہے کہ غالب عدم اور وجود، دونوں کا قائل نہیں ہے تو پھر کیا کہنا چاہتا ہے اور کس کا قائل ہے؟؟؟ اور یہاں ہستی سے مراد واجب الوجود ہی ہے کیونکہ عدم اسی کی ضد میں استعمال ہوتا ہے، غالب نے بھی یہی کہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے غالب نے ذات واجب الوجود کی بساطت کی طرف اشارہ کیا ہو، جہاں ہویت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، جو ذاتِ واجب الوجود کی ذات کا مرتبہ ہے، جہان وہ اسماوصفات سے بھی منزہ ہے، جہاں وجود پر بحث نہیں کی جاتی ہے. شاید اس کی مزید وضاحت دوسرے شعر میں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے صرف یہ منظور ہے کہ عالم کی کوئی صورت ہی نہیں ہے، بس وہ صرف نام ہے۔ میرے آگے اشیا کی ہستی صرف وہم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس شعر میں ممکنات کے وجود سے انکار تو ایک طرف ہے، بلکہ ہستی کا بھی انکار پایا جاتا ہے۔ ادبا کی وضاحتی تعبیریں اپنی جگہ درست کہ عالم کی صورت منظور نہیں ہے، وہ صرف نام ہے، اشیا کی ہستی وہم کے سوا کچھ نہیں لیکن اگر ہستی اشیا سے مراد واجب الوجود لیا جائے تو اس کا انکار پایا جاتا ہے اور اگر ہستی اشیا سے مراد ممکنات لیا جائے تو اس کا انکار پایا جاتا ہے! تو پھر آخر کس چیز کا اقرار کیا جائے؟ اگر منطقی و فلسفی بحث کی جائے تو کس کا وجود ثابت کیا جائے ؟!

مرزا غالب جب ذات حق تعالی کے وجود ذاتی کا ذکر کرتے ہیں، تو مقام بساطت کا ذکر کرتے ہیں، جو مقام ذات و مقام ہویت ہے، لیکن اس کے ساتھ محسوس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں (۱۲)

Vol.4 No.4 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

سیدھاسا مفہوم یہ ہے کہ مسجود سرحدِ ادراک؛ عقل وشعور کی سمجھ کی حدود، حدودِ اربعہ، شش جہات، حواسِ ظاہری، حواسِ باطنی، عقول عشرہ، معقولات، معلومات اور منقولات وغیرہ کی تمام حدود سے ماوریٰ ہے. وہ ہر طرح کی حدود و قیود سے ماوریٰ ہے. وہ ہی مسجود حقیقی ہے، جو مقامِ بساطت کا حامل ہے. یہ جو قبلہ و کعبۃ ہے، جس کی طرف منہ کرکے سجدہ کیا جاتا ہے، وہ تو اہلِ نظر کی نظر میں قبلہ نما ہے یعنی یہ قبلہ حقیقی کی طرف ظاہری طور پر رہنمائی کرنے والا ایک نشان اور ایک علامت ہے. اصل میں سجدہ قبلہ کو نہیں کیا جاتا بلکہ قبلہ کے ذریعہ سجدہ حقیقی مسجود کو کیا جاتا ہے، جو مادی حواس اور عقل وشعور کی سرحدوں سے ماوری ہے. یہاں قبلہ اور قبلہ نما اہم ہے کہ قبلہ وجود ظاہری ہے اور حقیقی مسجود ظاہری جہات سے منزہ ہے. لیکن اس شعر میں محسوسات کا تاثر بھی ملتا ہے، جو قبلہ اور قبلہ نما کے اشارے سے عیاں ہے. ایک اور شعر میں غالب فلسفی وحدت الوجود حقیقی معنی میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں (۱۳)

یہ شعر فلسفے کے اصولوں کے عین مباحث کے مطابق؛ علم وعالم ومعلوم کی بحث سے وابستہ ہے۔ غالب کے کہنے کے مطابق: جب شہود، شاہد اور مشہود کی اصل ایک ہے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ مشاہدے کو کس معیار اور مرتبہ کا تسلیم کیا جائے۔ یعنی پوری کائنات وجودِ واحد یعنی وجود حقیقی ذاتِ واجب الوجود کی وجہ سے قائم ہے تو شاہد اور مشہود ایک ہی ہوا۔ ذات اور وجود میں غیریت ناممکن ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا موجود ہی نہیں۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف شاہد ہے، دوسری طرف مشہود، تیسری طرف شہود ہے، عام معنوں میں تو مشاہدہ غیر کا ہوتا ہے۔ یعنی شاہد اور مشہود جدا جدا ہوں گے تو مشاہدہ صحیح قرار پائے گا۔ جب کہ سبھی کا وجود واحد ہے، سب کی اصل ایک ہے، سبھی میں کوئی غیریت اور جدائی نہیں ہے تو اس مشاہدے کو کس معیار اور مرتبہ کا قرار دیا جائے گا۔ یہ عرفا کا ایک مقام ہے، جہان غیریت کی نفی کی جاتی ہے۔ جہاں تمام موجودات کا وجود، واجب کے سوا، معدوم مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ ہاں مقام نزول میں، عام مشاہدہ میں، ممکن اور وجود میں صعودی اور نزولی یا عروجی مراتب کا مشاہدہ بھی قابل دید ہے۔ شاہد اور مشہود کا یہی حقیقی فرق ہے۔ شہود معنٰی دیکھنا، شاہد معنٰی دیکھنے والا، مشہود معنٰی جسے دیکھا جائے اور مشاہدہ معنٰی نظارا کرنا سب ایک ہی وجود ہیں۔ اسی غزل کے ایک اور شعر میں اسی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں (۱۴)

"مرتبہ احدیت تو غیب الغیب ہے اس کا ظہور اظلال مظاہر میں ہوتا ہے۔ واجب و ممکن میں بحیثیت الذات غیریت ہے اور بحسب الوجود عینیت ہے۔ یعنے وجود واحد مطلق، وجود حقیقی ہے اور عین واجب ہے اور یہی وجود مطلق ممکنات کی طرف بھی منتسب ہے۔ اس کی منطقی توضیح یہ ہے کہ ذات واجب نور مطلق اور عین وجود ہے، ممکن ظلمت محض ارو عدم خالص ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ نور کا اتحاد ظلمت کے ساتھ اور وجود کا اتحاد عدم کے ساتھ محال عقلی ہے اور جب اتحاد ہی ناممکن ہے تو دونوں کی وحدت خارج از بحث ہے پس لامحالہ ذات کے اعتبار سے واجب اور ممکن قطعی طور پر مغائر ہیں"۔(۱۵)

غیبِ غیب کو غیب الغیب بھی کہتے ہیں، اس سے مراد ہے مرتبہ احدیت ہے، جہاں تک عقل، ادراک اور فہم کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ ذاتِ احدیت کے مقام پر واجب الوجود قائم بذات حقیقت غیب الغیب ہے، جہاں بساطت کا مقام ہے۔ یہ تغیرات اور کثرات سے منزہ مقام ہے، حتیٰ کہ اسماء وصفات کی کثرت سے بھی منزہ ہے۔ بس یہی مقام غیب کا مقام ہے۔ علم غیب یا عالم غیب کا مرتبہ بھی یہی ہے۔ جب کثرت کا مقام یعنی اسماء وصفات کا مقام آتا ہے تو شاہد وشہود ومشہود اور مشاہدہ کا مقام شروع ہو جاتا ہے۔ یہ مقام اسماء صفات کے لیے بھی غیب کا مقام ہے۔ اسماو صفات مقام واحدیت کا مرتبہ ہے۔ لیکن غالب عظیم منطق سے کہتے ہیں: مقام احدیت مقام غیب ہے، اسے ہم نے غلطی سے شہود سمجھتے ہیں۔ ہم نے جسے شہود تسلیم کر لیا ہے، وہی غیب الغیب ہے۔ کیونکہ اس کے ظہور کا مرتبہ عیاں ہے، اس کے غیب کا مقام عیاں نہیں ہے۔ حق کہ ظاہر وباطن وہی ہے۔ اگر کوئی انکار کرے تو یہ ایسا ہے کہ کوئی خواب میں اپنے آپ کو یہ دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ کیونکہ جو خواب میں خود کو جاگتے ہوئے دیکھتا ہے، وہ دراصل نیند ہی میں ہوتا ہے۔ لیکن اس شعر میں پھر بھی نیند اور خواب کی مثال میں غیریت کا شائبہ دکھائی دیتا ہے، جو وجودیت کی نفی ہے، بحر حال بقولِ غالب؛ یہ عالم ہی عالم غیب ہے: غیب الغیب ہے: مقام ذات احدیت ہے، ہم نے اسے شہود سمجھ رکھا ہے، عالم کا خارج میں اپنا کوئی وجود نہیں ہے، وہی ذات اقدس ومقدس ہر عالم میں جلوہ گر ہے۔ بالفاظ دیگر جسے تم شہود سمجھتے ہو وہ دراصل غیب الغیب ہے۔ یہاں مولانا نیاز فتح پوری کے غالب پر کیے گئے غلو کے اعتراض کا بھی درست جواب دیا گیا ہے کہ جب مقام غیب ہی مقام شہود ہے، اس کی کوئی حد نہیں ہے، وہی واجب الوجود ہے، اسی کا وجود ہے، تو غلو کیسا! اور غلو کا سمجھنا خود ایک مقام اور ایک حد مقرر کرنا ہے، یا خود کو ذات واجب الوجود قرار دینا ہے، جبکہ واجب الوجود کی کوئی حد بھی ممکن نہیں ہے، تو غالی کا بھی کوئی امکان نہیں، کیوں کہ اسی کا وجود ہے۔ نہ حد ممکن ہے اور نہ کوئی غالی ہے، جو دعوائے خدائی کرے۔ ایک اور شعر میں کہتے ہیں:

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں (۱۶)

Vol.4 No.4 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

"غیر سے یہاں ماسوا اللہ مراد ہے، جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے، اس لیے کہ وہ وجود واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں، کہتا ہے کہ جس قدر وجود ماسوی کے وہم سے رات دن پیچ و تاب میں رہتا ہوں، اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنے وجود واجب سے بعد ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہاں لفظ بعد سے مراد دوری یا فاصلہ نہیں بلکہ بیگانگی یا عدم واقفیت مراد ہے۔ جب تک انسان غیر اللہ کو بھی حقیقی معنی میں موجود سمجھتا رہے گا یعنی جب تک وہم غیر میں گرفتار رہے گا اس وقت تک اسے اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے گی کیونکہ انسان کی اپنی حقیقت ہی کیا ہے؛ کچھ بھی نہیں، حقیقت میں وجود صرف واجب الوجود کا ہے، انسان صرف مظہرِ ذات وصفات حق ہے"۔(۱۷) یعنے وجود ایک ہے مگر جب ہم غیر کے وجود کے وہم میں جتنا الجھ جاتے ہیں، اتنا ہی وجود حقیقی سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی اسے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اس لیے جب عقل کامل ہو جاتی ہے، تو مادے اور روح میں جدائی کے حجاب اٹھ جاتے ہیں، کیونکہ بقول ملا صدرا؛ مادہ ہی سے روح جنم لیتی ہے۔ جس طرح علم حجابِ اکبر ہے، کیونکہ طالب علم کا پہلا مقصود علم ہوتا ہے۔ اگر طالبِ عالم کا مقصود علم نہ ہو بلکہ علم کو ذریعہ اور وسیلہ قرار دے کر حقائق تک پہنچنا ہو تو ایسا علم حجابِ اکبر نہیں ہوتا بلکہ علم بذات خود وجود دکھائی دیتا ہے۔ یعنی غیر حقائق معدوم ہو جاتے ہیں۔ غاؔلب اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں (۱۸)

حالی، مولانا عبد الرحمن بنجوری کے حوالے سے لکھتے ہیں:" معشوقِ عالم جو موجودات کے نقاب میں پنہاں ہیں، برابر اپنی جمال آرائی میں مصروف ہے اور آئینہ نقاب ہی میں لیے ہوئے اپنے غازے کو درست کر رہا ہے، جب عالم تکمیل کو پہنچے گا تو اپنے نقاب کو الٹ دیگا۔ عالم کو دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابی کسی چیز کی کمی ہے"۔(۱۹) بہت ہی عمدہ شعر ہے، وجود کی لا محدود ظہوریت کا مظہر ہے۔ کیونکہ ظاہر و باطن وہی ہے۔ بقولِ غالب:

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے (۲۰)

زمانہ اہلِ کمال کا مخالف رہا ہے، وہ نہ صرف ان کے کمالات سے بے خبر ہے بلکہ زمانہ خود بھی اہلِ کمال میں سے نہیں ہے۔

اگر اہلِ کمال میں سے ہوتا تو ان کی مخالفت پر کمربستہ نہ ہوتا۔ زمانہ کی نظر میں سورج، چاند، ستارے، جانور، درخت، آگ، پتھر، دریا وغیرہ کی اہمیت ہے کیونکہ زمانے کی نسبت ان سے قدیم ہے اور زمانہ ان کو خدا مان چکا ہے۔ اس لیے پتھر سے آواز آئے یا درخت سے آواز آئے یا آگ سے آواز آئے کہ میں حق ہوں یا میں تمہارا رب ہوں تو وہ اسے حق تسلیم کر لیتے ہیں؛ آیات الہی اس پر گواہ ہیں۔ لیکن جب کوئی اہلِ کمال کہے 'انا الحق' تو زمانہ سراپا احتجاج!!! غاؔلب نے اشارے سے دعوائے انا الحق کیا ہے اور منصور کو تنگ ظرفی کا حامل کہا ہے۔ غاؔلب نے کہا: ہماری ہستی کا قطرہ بھی سمندر ہے، ہمیں بھی فنا فی الذات کا مقام اور مرتبہ حاصل ہو چکا ہے لیکن ہمارا ظرف منصور کی طرح تنگ نہیں کہ چھلک جائے اور نعرائے انا الحق پکار اٹھیں، ہم اس کم حوصلہ اور بے ہمت کی پیروی نہیں کر سکتے کہ وہ فنا فی الذات کے مقام تک رسائی کے بعد صبر وضبط نہ کر سکا۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن

ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں (۲۱)

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل

کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا! (۲۲)

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا (۲۳)

قطرہ اور سمندر اور جزو کل کی اصطلاحیں واجب کے لیے مناسب نہیں ہیں، کیونکہ کل، جز کا محتاج ہوتا ہے، کل، جز سے کامل ہاتا ہے، جزو کل میں فکری طور پر دوئی کا تصور ہے؛ یہ اعتراض اس لحاظ سے تو قابلِ قبول ہے کہ عالمِ اسباب یعنی ممکن مخلوقات واجب الوجود کے اجزاء نہیں ہیں۔ کیونکہ ذاتِ واجب علت کامل ہے اور عالمِ امکان و عالم ماہتات اس کے معلول ہیں۔ علت و معلول میں ایک دوسرے سے اشراقی یا ظلی یا عرضی نسبت ہوتی ہے، نہ کہ کوئی جزوی؛ نہ علت، معلول ہے اور نہ معلول کو علت کہا جا سکتا ہے: سورج اور اس کی روشنی، پھول اور اس کی خوشبو، دودھ اور اس کی سفیدی کی مثالیں وغیرہ۔ اس طرح واجب الوجود ممکن نہیں اور ممکن واجب نہیں، جس طرح سفیدی، دودھ نہیں اور دودھ، سفیدی نہیں۔ باقی جزویت اور کلیت اور قطرہ اور سمندر کا جہاں تک شعر و شاعری میں بطور اصطلاحِ وحدت الوجود استعمال ہونا ہے، وہاں علامتِ صفاتِ و کمالات کے طور پر استعمال ہونا ہے؛ علامتِ کمالات کے لیے مناسب ہے۔ کیونکہ جو کمالات سمندر کے سارے پانی میں ہوتے ہیں، وہی کمالات ایک قطرے میں بھی ہیں، جو مٹھاس سیب میں ہے، وہی اس کے ٹکڑے میں بھی ہوتا ہے؛ ورنہ جزویت اور کلیت کی مثال واجب الوجود کے لیے باطل ہے۔ اسی لیے شعرا نے یہ علامتیں استعمال کی ہیں تاکہ اذہان کو حقائق کے قریب لایا جا سکے۔ اسی لیے تو روایات میں بھی آیا ہے کہ 'خود کو اخلاقِ الہی یا اوصافِ الہی سے مزین کریں' یا 'اپنے آپ میں اللہ تعالیٰ کے اخلاق پیدا کریں'۔ اسی طرح غاؔلب نے بھی جو بھی ایسی مثالیں پیش کی ہیں وہ بطور علامت ہیں، انھیں وحدت الوجود کا عقلی اصول نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ ان اشعار میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ وحدت الوجود کی مناسبت سے درست نہیں ہیں

Vol.4 No.4 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

بلکہ انھیں شاعرانہ یاصوفیانہ علامات قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس وجہ سے غالب نے کہا: "اثبات وحدت الوجود یعنی ہمارا کیا پوچھتے ہو، ہماری حقیقت کیا پوچھتے ہو، جو وہ ہے وہی ہم ہیں، ہمارا مرتبہ کیا پوچھتے ہو جو مرتبہ اس کا ہے وہی ہمارا ہے، وحدت الوجود، اس کے سوا کسی کا وجود ہی نہیں ہے۔ بس تمام مخلوقات تعین ہیں اگر تعین کا پردہ ہٹایا جائے تو قطرہ غائب ہو جائے گا"۔(۲۴)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا دوا ہو جانا (۲۵)

الغرض غاؔلب کے کلام میں بعض اشعار نظریۂ وحدت الوجود پر مشتمل ہیں۔ ان میں عمومیت بھی ہے تو خصوصیت بھی۔ جن میں خصوصیت ہے وہ عقلی، منطقی اور فلسفی اصولوں پر مشتمل ہیں اور جن میں عمومیت ہے وہ تصوفی عقائد پر مشتمل ہیں. جن سے یہ بات روز روشن عیاں ہوتی ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں چند فلسفی اشعار کا موجود ہونا، اس کے وحدت الوجودی شاعر ہونے کا باعث نہیں۔ کیونکہ وحدت الوجود صرف شاعرانہ نظریہ نہیں ہے بلکہ عین عقلی، عین اسلامی، عین وحدتی و توحیدی عقیدہ ہے. وہ الہیات اور عرفانی رمزوں سے مُزین ہے اور ہر صاحب عقل کے لیے باعثِ تسکین ہے. اس کا عامیانہ مفہوم صوفیا سے مختص ہے اور اس کا خصوصی مفہوم عقلا و عرفا و حکما سے مختص ہے۔ یہ ایک عقلی نظریہ ہے، اسے صوفی کہنا نامناسب ہےُ۔ یہاں تک کہ جس حقیقت کو حکمت و فلسفہ وحدت الوجود کا نام دیتا ہے، اسے منطقی لحاظ سے واجب الوجود کہا جاتا ہے، جب کہ ایک جہت سے دہریہ اسے مادہ کہتے ہیں۔ فرق صرف نام کا ہے؛ پر اسے مادہ کا نام دینا مخلوق سے مناسب ہے۔ الغرض مرزا اسد اللہ خان غاؔلب اپنے فلسفی اشعار میں ذات واجب الوجود کو ماسوا سے الگ تصور نہیں کرتے، اگر الگ تصور کرتے تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ ماسوائے واجب الوجود، تمام ممکنات اور مخلوقات بھی ازلی اور قدیم وجود ہیں، ان کے وجود بھی اپنے ذاتی ہیں اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ماسوائے ذات واجب الوجود بھی خدا ہیں، ان کا وجود بھی قدیم ازلی اور ذاتی ہے(لاحول و لاقوۃ)۔ یہ وحدت الوجود نہیں بلکہ شرک ہے۔ وحدت الوجود یہ ہے کہ ماسوائے واجب الوجود، تمام ممکنات اور ماہیات اور مخلوقات کو، چاہے نوری ہوں یا ناری یا مادی ہوں، سبھی کو واجب الوجود کے وجود سے وجود عطا ہوا ہے۔ وہ وجودِ حق کے نوری، اشراقی اور ظلی تجلیاں اور جلوے ہیں۔ ممکنات اور مخلوقات کا اپنا ذاتی وجود نہیں ہے۔ اگر ان کا ذاتی وجود ہوتا تو ازل ہی سے ان کا نام نشان ہوتا، ازل ہی سے قدیم کی کثرت پیدا ہو جاتی اور ازل ہی سے بیشتر وجود کا اقرار کرنا پڑتا۔ اس لیے عقلی اصول یہ ہے کہ ازل ہی سے ایک وجود تسلیم کیا جائے۔ ممکنات کو ان کا اشراقی اور ظلی وجود تسلیم کیا جائے۔ جس سے نہ وحدت باطل ہوتی ہے اور نہ کثرت کو وحدت سے جدا کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کثرت کو وحدت تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ وحدت اپنی جگہ اور اپنے مقام پر باقی رہتی ہے اور کثرت اپنے مقام پر برقرار رہتی ہے۔ اسی لیے یہی حقیقی وحدت الوجود ہے، جو عین عقلی اور عین فطری ہے۔ یہ محض صوفیانہ نظریہ نہیں ہے اور نہ کوئی شاعرانہ خیال ہے، بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ مسلم دنیا میں صوفیانہ طرز زندگی اور شاعرانہ اسلوب اس کے اظہار کے عمومی نمونوں میں سے ایک نمونہ ہے اور ان کی زندگی کا شیوہ ہے۔ بس فلسفہ نے حسین کے حسن کے چہرے سے نقاب کے سارے بند کھول دیئے ہیں؛ تمام حجاب دور کر دیئے ہیں، بس نگاہ کا پردہ باقی رہ گیا ہے اور یہی حقیقی عقلی و منطقی و فلسفی و عرفانی والاہی نظری و عملی وحدت الوجود ہے

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا (۲۶)
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا (۲۷)
وا کر دئے شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا! (۲۸)

حوالہ جات:

(۱)۔ مجلسی، محمد باقر، علامہ: "بحارالانوار، الجزو الاول، الموسسۃالعلمی المطبوعات، بیروت، ۲۰۰۸، ص ۸۶

(۲)۔ رنگین فیروز اللغات اردو جامع، مرتبہ الحاج مولوی فیروز الدین، نظر ثانی ادارہ تصنیف و تالیف لاہور، ۲۰۰۵ع

(۳)۔ شبلی نعمانی، علامہ: "شعر العجم"، جلد ۵، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، سن ندارد ص ۱۳۷

(۴)۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر: "شرح دیوانِ غالب"، عشرت پبلشنگ ہاوس ہسپتال روڈ انار کلی لاہور پاکستان، بار اول، جنوری ۱۹۵۹، ص ۱۶۹

(۵)۔ حیدری، محمد صادق: "المعرفت النورانیہ"، جعفر صادق پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷، ص ۸۰

(۶)۔ مہر، غلام رسول: "نوائے سروش" (مکمل دیوانِ غالب مع شرح)، شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشر لاہور، سن ندارد، ص ۱۲۵۔

(۷)۔ ایضا: ص ۱۲۵۔

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

(۸)۔نیاز فتحپوری، مولانا:"ولی بادہ خوار"،مشمولہ،"غالب کا خصوصی مطالعہ"،مرتب:پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی،
شیخ محمد بشیر اینڈ سنز،لاہور،سن ندارد،ص ۲۸۲

(۹)۔ مہر،غلام رسول:نوائے سروش (مکمل دیوانِ غالب مع شرح)،شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ)لمیٹڈ،
پبلشرز،لاہور،سن ندارد،ص ۹۱۵

(۱۰)۔ایضا:ص ۶۶۲

(۱۱)۔ایضا،ص ۳۳۷

(۱۲)۔ایضا:ص ۲۸۲

(۱۳)۔ایضا: ص ۳۲۴

(۱۴)۔ایضا: ص ۳۲۴

(۱۵)۔یوسف سلیم چشتی،پروفیسر:"شرح دیوانِ غالب"،عشرت پبلشنگ ہاوس ہسپتال روڈ انارکلی لاہور پاکستان،
بار اول،جنوری ۱۹۵۹،ص ۲۰۹

(۱۶)۔مہر،غلام رسول:نوائے سروش (مکمل دیوانِ غالب مع شرح)،شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ)لمیٹڈ
پبلشرز،لاہور،سن ندارد،ص ۳۲۴

(۱۷)۔یوسف سلیم چشتی،پروفیسر:"شرح دیوانِ غالب"،عشرت پبلشنگ ہاوس ہسپتال روڈ انارکلی لاہور پاکستان،
بار اول،جنوری ۱۹۵۹،ص ۵۲۵

(۱۸)۔مہر،غلام رسول:نوائے سروش (مکمل دیوانِ غالب مع شرح)،شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ)لمیٹڈ،
پبلشرز،لاہور،سن ندارد،ص ۳۲۴

(۱۹)۔ایضا:ص ۳۳۰

(۲۰)۔ایضا:ص ۶۲۱

(۲۱)۔ایضا:ص ۳۳۷

(۲۲)۔ایضا،ص ۹۵

(۲۳)۔ایضا،ص ۸۸

(۲۴)۔یوسف سلیم چشتی،پروفیسر:"شرح دیوانِ غالب"،عشرت پبلشنگ ہاوس ہسپتال روڈ انارکلی لاہور پاکستان،
بار اول،جنوری ۱۹۵۹،ص ۳۲۵

(۲۵)۔مہر،غلام رسول:نوائے سروش (مکمل دیوانِ غالب مع شرح)،شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ)لمیٹڈ،
پبلشرز،لاہور،سن ندارد،ص ۱۷۴

(۲۶)۔ایضا: ص ۸۳

(۲۷)۔ایضا: ص ۹۵

(۲۸)۔ایضا: ص ۱۵۲

کتابیات:

(۱)۔حیدری،محمد صادق:"المعرفت النورانیہ"،جعفر صادق پبلشرز،لاہور،۲۰۰۷

(۲)۔رنگین فیروز اللغات اردو جامع،مرتبہ الحاج مولوی فیروز الدین،نظر ثانی ادارہ تصنیف و تالیف لاہور،۲۰۰۵

(۳)۔شبلی نعمانی،علامہ:"شعر العجم"،جلد ۵ ، نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،سن ندارد

(۴)۔مجلسی،محمد باقر،علامہ:"بحار الانوار،الجزو الاول،الموسستہ العلمی المطبوعات،بیروت،۲۰۰۸

(۵)۔مہر،غلام رسول:"نوائے سروش"(مکمل دیوانِ غالب مع شرح)،شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور،سن ندارد

(۶)۔نیاز فتحپوری،مولانا:"ولی بادہ خوار"،مشمولہ،" غالب کا خصوصی مطالعہ"،مرتب:پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی،شیخ محمد بشیر اینڈ سنز،لاہور،

(۷)۔یوسف سلیم چشتی،پروفیسر:"شرح دیوانِ غالب"،عشرت پبلشنگ ہاوس،روڈ انارکلی لاہور پاکستان،بار اول،جنوری ۱۹۵۹